اسلام کے تصور مصالحت ومفاہمت کی تحدید:ایک تحقیقی مطالعہ

Demarcation of Islamic Concept of Compromise: A research Study

محمد ایاز[i] سمیع الحق[ii]

Abstract

Islam is the only acceptable religion before Allah, which demands its followers to surrender and submit his/her will to the will of Allah Almighty. By doing so, the Muslims will enjoy peace, tranquility and eternal solvation. Being the religion of peace, Islam encourages and promotes dialogues, treaties and compromise with Non-Muslims, provided that its basic ideology, originality, distinction and identity is not disturbed.

The given article critically discusses demarcation of Islamic concept of compromise. On one hand it points out such occasions, where Islam teaches and encourages compromise, tolerance and cooperation to create and maintain peace, harmony and conducive environment, which resulted in benefits. On the other hand those occasions have also been discussed where Islam does not recommended any flexibility, but emphasis to stand still and stick to your stance for the sake of preserving the distinction. By giving references from Quran, Hadith & Seerat, it has been proved that Islam strongly recommends mutual co-existence with the Non-Muslims, but never ready for mutual co-acceptance.

Key words: *Islam, Quran, Hadith , Seerat, Muslims, demarcation*

اسلام کے معنی اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اوامر کے سپرد کرنے اور پورے طور سے گردن نہاد ہونے کے ہیں اور جب بندہ اپنے آپ کو حوالہ کر کے بلا چون وچراں تسلیم ہو جاتا ہے تو وہ امن وسلامتی پاتا ہے۔اس لئے کہ اسلام اپنے پیروکاروں کو امن وسلامتی کی ضمانت دیتا ہے۔ارشاد ہے:

"ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ وَلَمۡ يَلۡبِسُوٓاْ إِيمَٰنَهُم بِظُلۡمٍ أُوْلَٰٓئِكَ لَهُمُ ٱلۡأَمۡنُ وَهُم مُّهۡتَدُونَ[1]"

"جو لوگ ایمان لائے اور ایمان کے ساتھ شرک کی ملاوٹ نہیں کی تو یہی لوگ امن سے رہیں گے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔"

بلکہ جہاں سے آپ ﷺ نے سب سے پہلے اسلام کی صدا بلند کی،اس مقام کو بھی اللہ تعالیٰ نے جائے امن قرار دیا، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَإِذۡ جَعَلۡنَا ٱلۡبَيۡتَ مَثَابَةٗ لِّلنَّاسِ وَأَمۡنٗا[2]"

---

[i] اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اسلامک تھیالوجی،اسلامیہ کالج پشاور

[ii] اسسٹنٹ پروفیسر،شعبہ اسلامیات،شہید بینظیر بھٹو یونیورسٹی شرینگل

"اور جب ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لئے مرکز اور امن کی جگہ بنایا۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"وَمَن دَخَلَهُ كَانَ ءَامِنا[3]"

بلکہ اس مرکز امن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قریش کو مکہ سے باہر بھی امن دیا اور باہر کے لوگ بھی بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی وجہ سے قریش کے قافلوں کو نہیں چھیڑتے جس کو اللہ تعالیٰ نے سورۃ قریش میں ذکر فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے روم کے بادشاہ ہرقل کو بھیجنے والے خط میں بھی یہ لکھوایا تھا کہ میں تم کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں کہ مسلمان ہو جاؤ، سلامتی پاؤ گے[4] ۔امن وسلامتی کا ضامن دینِ اسلام اللہ تعالیٰ کے ہاں واحد مقبول دین ہے۔ فرمایا:

"إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ[5]"

"اللہ تعالیٰ کے ہاں (واحد مقبول) دین اسلام ہے۔"

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ[6]"

"جو اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو تلاش کرے گا تو ہرگز اس سے وہ قبول نہیں کیا جائے گا اور آخرت میں وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔"

بلکہ نبی کریم ﷺ کی بعثت اس لئے کی گئی کہ دین حق (اسلام) کو باقی تمام باطل ادیان پر غالب کرے، ارشاد ہوتا ہے:

"هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ"

"اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق دیکر اس لئے بھیجا کہ اس کو باقی تمام باطل ادیان پر غالب کر دے، اگرچہ کافر لوگ اس کا بہت برا مانے۔"

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ روئے زمین پر کسی غیر مسلم کو برداشت ہی نہ کیا جائے، بلکہ اس معاملے میں تو اسلامی تعلیمات انتہائی وسیع النظری پر مبنی ہیں، ہاں البتہ جہاں پر اسلام کی امتیازی شان مٹ جانے یا اسلام کے بنیادی تصور پر آنچ آنے کا اندیشہ ہوتا، وہاں آپ ﷺ نے ہرگز کوئی سمجھوتہ نہیں کیا، بے جا نرمی اور مصلحت سے کام نہیں لیا۔ لہٰذا زیر نظر مقالہ میں اسلام کے تصور مفاہمت و مصالحت کی تحدید کے حوالے سے بحث کی جاتی ہے کہ آپ ﷺ نے کن کن مواقع پر غیروں سے مصالحت و مفاہمت سے کام لیا۔ اس میں آپ ﷺ کس حد تک گئے ہیں اور اس کے کیا مثبت و مفید نتائج برآمد ہوئے اور کہاں کہاں پر آپ ﷺ اپنے موقف پر ڈٹے رہے، جمے رہے اور سرِ مو نہیں ہٹے اور آپ نے کیوں مصالحت نہیں کی اور پھر اس کا کیا مثبت نتیجہ نکلا۔ اسلام ہمیں مصالحت و مفاہمت کی خاطر آخری حد تک جانے کی اجازت دیتا ہے۔ میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ اور دیگر واقعات اس پر دال ہیں اور یہی مصالحت و مفاہمت کسی اخلاقی گراوٹ، موقف کی کمزوری یا دنیوی لالچ کی بناء پر نہیں تھی بلکہ حکمت کا تقاضا تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ہدایت پر آئیں۔ مثلاً ہجرت کے فوراً بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے مہاجرین وانصار کے

درمیان اخوتِ اسلامی کا مضبوط رشتہ قائم کیا اور اس کے فوراً بعد ہجرت کے پہلے ہی سال مسلمانوں اور مدینہ میں بسنے والے دیگر شہریوں (یہودی قبائل، نصاری اور کفار) کے مابین مصالحت ومفاہمت کی فضاء قائم کی جسے میثاق مدینہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جس کے شرائط درج ذیل ہیں:

- تمام شرکائے معاہدہ ایک سیاسی وحدت ہوں گے، آپس میں ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچائیں گے اور مظلوم کی امداد سب پر فرض ہوگی۔
- مدینہ کے اندر کوئی خون ریزی نہیں ہوگی۔
- سب کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔
- قریش مکہ کو کوئی بھی پناہ نہیں دے گا۔
- کسی بھی گروہ پر حملہ پوری ریاست پر حملہ تصور ہوگا اور اس صورت میں ملکر دشمن کا مقابلہ کریں گے۔
- مجرموں کا تعاقب کیا جائے گا۔ خون بہا اور فدیہ کا پہلے سے رائج طریقہ برقرار رہے گا۔
- باہمی نزاعات میں آپ ﷺ کا فیصلہ حتمی تسلیم کیا جائے گا[7]۔

عالمی رواداری پر مبنی ان شرائط وتعلیمات کو سب نے بخوشی قبول کر لیا۔ یہ معاہدہ بہت سود مند ثابت ہوا۔ سب کو شہری آزادی مل گئی۔ مسلمان ایک عرصے تک اطمینان سے تبلیغ کرنے لگے، مدینہ کو حرم کا درجہ حاصل ہوا۔ دفاعی لحاظ سے مدینہ اور اس کے نواح کی پوری آبادی متحدہ قوت بن گئی۔ سیاسی، قانونی اور عدالتی لحاظ سے آخری اختیار نبی کریم ﷺ کو حاصل ہوا۔

اسی طرح ۶ھ میں صلح حدیبیہ مشرکین مکہ کے ساتھ ہو گیا جس کے اکثر شرائط بظاہر مسلمانوں کے خلاف نظر آرہے تھے لیکن چونکہ اس میں اسلام کی امتیازی شان کے مٹنے یا اس میں ترمیم کا کوئی خطرہ نہیں تھا، بلکہ نبی کریم ﷺ کی دور بین نگاہ اس میں اسلام کی اشاعت اور غلبہ مشاہدہ کر رہی تھی، لہذا ان تمام شرائط پر صلح کر کے مصالحت ومفاہمت کی فضاء قائم کی۔ مثلاً اسی سال عمرہ کرنے کے بجائے آئندہ سال کرنے میں کوئی دینی نقصان نہیں تھا۔ بسمک اللھم لکھنے میں کوئی دینی قباحت نہیں تھی۔ محمد بن عبداللہ لکھنا بھی دین اسلام اور عقیدہ رسالت کے منافی نہیں تھا۔ مزید یہ کہ مدینہ سے کوئی بھاگ کر مکہ آجائے تو اس کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ یہ شرط بھی بظاہر مسلمانوں کی انتہائی کمزوری دکھا رہا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہؓ کو ایک عرصہ سے آزما چکے تھے جو وطن، والدین، خویش واقارب، مال ودولت کو چھوڑ سکتے تھے لیکن نبی کریم ﷺ کو چھوڑنے کے لئے ہر گز تیار نہیں تھے۔ بدر، اُحد اور خندق میں جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لئے تو تیار تھے لیکن نبی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ لہذا مصالحت ومفاہمت کی خاطر قریش مکہ کے ساتھ یہ شرط تسلیم تو کر لیا لیکن آپ ﷺ کو یقین تھا کہ عملاً اس کی نوبت انشاءاللہ نہیں آئے گی۔

کفار کی یہ تمام کج روی اور ضد وعناد اس لئے برداشت کی کہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی تیار کردہ جماعت کے پاس ایک پیغام تھا جو کہ قیام امن اور حصولِ فلاح کے لئے پورے اقوام عالم کو دینا تھا چونکہ گذشتہ ۱۹ سالہ طویل اور مسلسل دشمنی میں مسلمانوں کو کھل کر اس دعوت کو پیش کرنے اور کفار ودیگر غیر مسلموں کو سنجیدگی اور غور سے مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لہٰذا اس صلح میں ایک شرط یہ تھی کہ فریقین دس سال تک آپس میں نہیں لڑیں گے، جس کی بنیاد پر مسلمانوں کو کھل کر اپنا پیغام پیش کرنے اور غیروں کو اس کو دیکھنے کا موقع ملے گا۔ جب دس سال تک آپس میں لڑائی نہیں ہوگی تو انشاءاللہ اس عرصہ میں یہ سارے ہمارے ہی ہوں گے۔ لہذا اس ایک شرط کی آڑ میں آپ ﷺ نے کفار کے باقی تمام شرائط قبول کر لیے اور ان میں سے کوئی شرط اسلام کے بنیادی تعلیمات کیخلاف نہیں تھا۔ نہ عقیدہ میں بگاڑ آتا اور نہ ہی اسلام کی امتیازی شان مٹ جانے کا خطرہ تھا بلکہ مستقبل میں اسلام کا غلبہ اشاعت و پھیلاؤ آپ ﷺ کی دور بین نگاہوں کے سامنے تھا۔

نتیجتاً ایسا ہی ہوا اس صلح کو قرآن کریم نے فتح مبین بتایا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے بڑے فاتح اس دوران مسلمان ہوئے۔ مزید یہ کہ خیبر کے یہود بھی اکیلے ہو گئے، اس لئے کہ اب کفار مکہ مسلمانوں کے خلاف ان کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے، لہذا اسی دوران خیبر فتح ہوا اور یہ صلح آئندہ فتوحات کا پیش خیمہ بھی ثابت ہوا۔ باہمی میل جول بڑھ گیا جس کی وجہ سے اسلام تیزی سے پھیلنے لگا۔ باہر کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط بھی بھیجے گئے۔

لیکن اس کے برعکس جب مکی دور میں کفار و مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ کو کچھ لو کچھ دو کی پالیسی اپنانے کی پیشکش کی تھی، یعنی کہ ایک سال ہم کفار بھی تمہارے ساتھ اس رب کی عبادت کریں گے جس کی عبادت تم کرتے ہو لیکن اگلے سال ہمارے ارباب کی باری ہوگی اور ہمارے ساتھ آپ ﷺ اور صحابہ کرامؓ بھی ان بتوں کو پوجیں گے جن کو پوجا پاٹ ہم کر رہے ہیں اور نتیجہ یہ ہوگا کہ باہمی جھگڑے کے بجائے مصالحت ومفاہمت کی فضاء قائم ہوگی لیکن قرآن گواہ ہے کہ اس صلح کیلئے نبی کریم ﷺ ایک لمحے کے لئے بھی تیار نہیں ہوئے اگرچہ مسلمان اس وقت بہت کمزور اور کسمپرسی کی حالت میں تھے۔ مدنی دور کی نسبت اس وقت مصالحت ومفاہمت کے زیادہ خواہاں تھے اور آپ ﷺ سب سے بڑھ کر صلح جو تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سے اسلام کی امتیازی شان بالکل مٹ جاتی۔ توحید وبت پرستی میں فرق باقی نہ رہتا۔ حق و باطل کی تمیز ہرگز نہ ہو سکتی تھی۔ پھر لوگوں کو توحید کی دعوت دینا بالکل بے معنی رہ جاتا۔ اس لئے اس پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ الکافرون نازل فرمائی:

"قُلْ يَا أَيُّهَا الْكَافِرُونَ لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ وَلَا أَنَا عَابِدٌ مَا عَبَدْتُمْ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ[8]"

اسی طرح جب کفار مکہ نے طیش میں آکر بغیر سوچے سمجھے معاہدہ حدیبیہ کو توڑنے کا اعلان کر دیا اور بعد میں اپنی حماقت کا احساس ہوا تو ابوسفیان صلح کی تجدید کے لئے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے لیکن اب نبی کریم ﷺ نے صلح کرنے سے

انکار فرمایا،اس لئے کہ صلح حدیبیہ کے دوران کفار کے تمام الٹی سیدھی برداشت کرنے کے بعد جب انہوں نے خود جلد بازی میں جذباتی فیصلہ کر کے معاہدہ کو توڑا لہذا اب بھی اگر مسلمان اپنے حلیف، قبیلہ بنو خزاعہ کے ساتھ تعاون نہ کرتے اور ان کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیتے تو پھر کوئی بھی مسلمانوں کا کبھی ساتھ نہ دیتا،۔نہ ان پر کسی کا اعتماد باقی رہتا۔اس لئے کہ یہ حلیف، معاون اور مظلومین کی مدد سے دستبردار ہونے کے لئے مشہور ہو جاتے۔لہذا اس وقت مصلحت اسی میں تھی کہ صلح کی تجدید نہ کی جائے۔

فتح مکہ اور غزوہ حنین کے بعد نبی کریم ﷺ نے طائف والوں (بنو ثقیف) کی طرف آدمی بھیجے کہ انہیں اسلام کی دعوت دیں۔انہوں نے مشروط طور پر اسلام لانے کی دعوت کو قبول کیا اور کہا کہ ہم بت نہیں توڑیں گے، نماز نہیں پڑھیں گے، زکوٰۃ نہیں دیں گے اور جہاد نہیں کریں گے۔اس پر آپ ﷺ نے پہلے دو شرائط پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور فرمایا کہ بت تو توڑنے پڑیں گے اور اس دین میں کوئی خیر نہیں جس میں نماز نہ ہو[9]۔جب کہ باقی دو احکام پر فی الحال زور نہیں دیا۔

پہلی بات پر اس لئے سمجھوتہ نہ ہو سکا کہ توحید اور بتوں کی محبت وعقیدت ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔کلمہ طیبہ میں بھی اللہ تعالیٰ کی معبودیت کو تسلیم کرنے سے پہلے غیر اللہ کے اختیار کا انکار کرنا پڑتا ہے۔اسی طرح نماز چھوڑنے کی شرط کو بھی تسلیم نہیں کیا۔اس لئے کہ اس سے پھر اسلام کا امتیاز ظاہری طور پر باقی نہ رہتا کہ مومن اور کافر کے درمیان تو نماز چھوڑنے کا فرق ہے۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ[10]"

"اور نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ بنو۔ "

اسی طرح حدیث میں وارد ہے:

"بندہ اور کفر کو ملانے والی چیز صرف نماز چھوڑنا ہے اسی طرح ارشاد ہے کہ بندہ اور کفر وشرک کے درمیان نماز چھوڑنے کا فرق ہے[11]۔"

مثلاً بازار میں مسلمان کی بھی دوکان ہے اور غیر مسلم کی بھی۔اب اذان پر مسلمان بھی غیر مسلم کی طرح مسجد کی طرف نہ چلے تو دونوں میں ظاہری فرق تو نہ رہا۔البتہ باقی دو احکام کے بارے میں فرمایا کہ جب اول الذکر دونوں کام کریں گے تو باقی دونوں کو بھی کر لیں گے اور حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا اس لئے کہ زکوٰۃ تو صرف صاحب نصاب پر فرض ہے، ہر ایک پر نہیں اور وہ بھی سالانہ عبادت ہے۔لہذا جب بتوں کو توڑ کر توحید کا اقرار کرنے اور روزانہ نماز پنجگانہ پڑھتے پڑھتے ایک سال گزر جائے گا تو ان اعمال کے کرنے اور مسلمانوں کے ساتھ میل ملاپ سے ان میں باقی اعمال کرنے کی سکت بھی پیدا ہو گی۔اسی طرح جہاد بھی اگرچہ بہت ہی اہم حکم ہے لیکن اس وقت کے حساب سے قرب وجوار کے تمام علاقے فتح ہو چکے تھے۔مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، خیبر اور طائف میں اسلام کا جھنڈہ لہرا رہا تھا اور اگر مزید

بھی کہیں مجاہدین کی ضرورت پڑتی تو طائف والوں کے علاوہ بھی مسلمانوں کی کثیر تعداد اس مبارک عمل کے لئے موجود تھی۔ لہذا فی الحال اس پر بھی آپ ﷺ نے زور نہیں دیا۔

لیکن ان احکام کو معاف بھی نہیں کروایا۔ جب آپ ﷺ پر دین کی تکمیل ہو چکی اور اسلام اب سرزمین عرب سے باہر قدم رکھنے کی پوزیشن میں تھا کہ آپ ﷺ کا وصال ہو گیا، جس پر بعض قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیقؓ جو آپ ﷺ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے نے کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کیا بلکہ اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی تھا جو آپؓ نے کر لیا۔ آپؓ کے عزم صمیم اور بروقت دوراندیشانہ کاروائی نے اس فتنے کا سر کچل دیا۔ شریعت ہمیں اسلام کے مٹنے اور بڑے دینی نقصان کے بدلے مصالحت ومفاہمت کا اجازت نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ[12]"

"اے ایمان والوں اہل کتاب اور کفار میں سے ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی کھیل بنا رکھا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اگر تم مؤمن ہو۔"

گویا اس حد تک مصالحت ومفاہمت سے کام لیا جہاں تک اسلام کی حقیقی روح اور امتیازی شان پر ضرب نہ پڑتی اور جہاں اسلام کے امتیازی شان کو ذرہ بھر بھی خطرے کا اندیشہ ہوتا تو ہرگز کسی مصلحت کو خاطر میں نہیں لایا:

"حضرت ابو عمیر بن انسؓ اپنے انصاری بچوں سے نقل کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ کو نماز کے بارے میں بڑا فکر ہوا کہ اس کے لئے کیسے لوگوں کو جمع کریں۔ کسی نے تجویز پیش کی کہ نماز کا وقت شروع ہونے پر ایک جھنڈا کھڑا کر دیا کریں، لوگ جب جھنڈے کو دیکھا کریں گے تو ایک دوسرے کو بتایا کریں گے لیکن آپ ﷺ کو یہ رائے پسند نہ آئی۔ پھر کسی نے یہودیوں کے بگل کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ آیا اور فرمایا یہ تو یہودیوں کا کام ہے۔ پھر کسی نے آپ ﷺ سے گھنٹی کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ تو عیسائیوں کا کام ہے۔ آپ ﷺ کی غایت اہتما کو دیکھ کر حضرت عبداللہ بن زیدؓ کو بھی فکر لاحق ہوئی، چنانچہ اسے خواب میں اذان سکھائی گئی[13]۔"

نماز جیسی بڑی عبادت کو بھی ان اوقات میں مکروہ قرار دیا گیا جن میں سورج طلوع وغروب ہوتا ہوتا کہ شمس پرستوں کے ساتھ مشابہت نہ ہو بلکہ دوٹوک اور صاف فرمایا:

"من تشبه بقوم فهومنهم[14] "

"جو جس قوم کی مشابہت اختیار کر لیتا ہے وہ انہی میں سے ہو جاتا ہے۔"

ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کے امتیازی شان کو برقرار رکھنے کا کس قدر اہتمام کیا گیا ہے۔ ہمارے قبلے ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہماری علامات ایک دوسرے سے جدا جدا، کہیں پر صلیب اور کراس (Cross) ہو گا کہیں پر چھ کونوں والا تارہ، کہیں پر کچھ اور کہیں پر کچھ جس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

عصر حاضر کے فتنوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حق (اسلام) باطل (ادیان) کے ساتھ خلط ملط ہو جائے تاکہ اس کی شناخت اور امتیازی شان ختم ہو جائے۔ بظاہر اس کو ہم آہنگی، مصالحت و مفاہمت کے خوشنما نام دیئے جاتے ہیں جو بالآخر وحدت ادیان کے تصور پر منتج ہوتا ہے، گویا مسجد، گرجا، کلیسا اور مندر میں عبادت کرنے اور پوجا پاٹ کرنے والوں کو ایک ہی چھتری کے نتیجے لانے اور سب کو بہشت کا یکساں مستحق قرار دینے کا تصور دیا جاتا ہے گویا مفاہمت و مصالحت کا یہ مفہوم دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ کوئی بھی مسلمان کسی یہودی، عیسائی، ہندو، مجوسی یا دوسرے دین دشمن لوگوں سے اختلاف نہیں کر سکے گا۔ان کی انسان دشمن پالیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لئے کمربستہ نہیں ہو گا۔اسی فکر کے قائلین قرآن کریم کی درج ذیل آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَى وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ[15]"

"بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے یہودیت اختیار کی، اور نصاریٰ اور صابئین، ان میں سے جو بھی اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے سو ان کے لیے اجر ہے ان کے رب کے پاس اور ان لوگوں پر کوئی خوف نہیں اور نہ وہ رنجیدہ ہوں گے۔"

حالانکہ یہی آیت قبول باہمی اور وحدت ادیان کے ابطال کے لئے ایک قوی دلیل ہے۔ مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی بلند شہری (۱۴۲۲ھ) اپنی تفسیر میں اسی آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں:

"گذشتہ آیت میں ارشاد فرمایا تھا کہ یہودیوں پر ذلت اور مسکنت لازم کر دی گئی اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہوئے اور اس کا سبب یہ بتایا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کا انکار کرتے تھے اور حضرات انبیاء کرامؑ کو قتل کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی وجہ سے مطرود اور مردود ہونا کوئی یہودی قوم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہونا اور مستحق اجر و ثواب ہونا اور قیامت میں بے خوف اور بے غم ہونا کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، جو بھی کوئی شخص ایمان کی صفت سے متصف ہو گا وہ اپنے رب کے نزدیک مستحق اجر و ثواب اور بے خوف و بے غم ہو گا۔ یہ ایمان کی صفت ہر قوم کے اپنے اپنے زمانہ کے اعتبار سے تھی۔ یہودیوں کا ایمان یہ تھا کہ حضرت موسیٰؑ پر اور تورات شریف پر ایمان لائیں اور ہر اس عقیدے کو مانیں جو حضرت موسیٰؑ نے بتایا۔ پھر جب عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اور انجیل شریف پر ایمان لانا اور ان کی شریعت کو پوری طرح سے ماننا اور جو کچھ انہوں نے بتایا اس کو تسلیم کرنا یہ ان کے زمانہ کے لوگوں کا ایمان تھا جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول تھا جو لوگ ان پر ایمان نہ لائے یا ایمان لائے لیکن بعد میں ان کی شریعت کو بدل دیا اور ان کے دین میں شرک داخل کر دیا، وہ لوگ مومن نہ رہے۔ یہودیوں نے جب ان کی نبوت و رسالت سے انکار کیا تو ان میں جو اب تک مومن تھے تو وہ بھی کافر ہو گئے۔ پھر جب خاتم النبیین سرورِ عالم حضرت محمد ﷺ کی بعثت ہوئی جن کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی: "ومبشراً برسول یاتی من بعدی اسمه احمد" اور جن کا تذکرہ توریت و انجیل میں پاتے تھے "یجدونه مکتوباً عندهم فی التورة والانجیل" تو اب ایمان یہ ہو گیا کہ حضرت سرور عالم ﷺ پر ایمان لائیں اور آپ کی ہر بات تسلیم کریں۔اس لئے سورہ آل عمران میں فرمایا کہ جو شخص بھی اسلام کے علاوہ

کوئی دین چاہے گا سو وہ اس سے ہر گز قبول نہ کیا جائے گا۔ جتنی قومیں بھی دنیا میں بستی ہیں اور جتنے بھی مذاہب آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا میں موجود تھے یا اب موجود ہیں خواہ وہ کسی نبی کے ماننے اور پیرو ہونے کے مدعی ہوں اور خواہ کسی بھی دین پر ہوں ان سب پر فرض ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائیں اور ہر وہ عقیدہ تسلیم کریں اور مانیں جو آپ ﷺ نے بتایا۔ قیامت تک کے لئے ہر قوم، ہر جماعت، ہر فرد اور ہر علاقہ کے انسان آپ کی امت دعوت میں شامل ہیں:

"قل یاایھاالناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً""آپ فرمادیجئے اے لوگو! بے شک میں اللہ کا پیغمبر ہوں تم سب کی طرف۔ "سورہ فاطر میں ارشاد فرمایا" **وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیرا ولکن اکثر الناس لایعلمون""**اور ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام انسانوں کے لئے پیغمبر بنا کر خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ "لہٰذا جب سے آپ ﷺ کی بعثت ہوئی ہے یہودی و نصرانی فرقہ صابئین اور ہر قوم اور ہر اہل مذہب کے لئے معیار نجات صرف سیدنا حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اور کسی قسم کا کوئی ایمان معتبر نہیں صرف یہی ایمان معتبر ہے کہ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے اور آپ ﷺ نے جو کچھ بتایا ہے اس کو دل سے مانے اور تسلیم کرے۔ حتی کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام سے خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے اور آپ کی نصرت کرنے کا اقرر لیا گیا تھا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ"

"اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ میں جو کچھ بھی تم کو کتاب و حکمت عطا کروں پھر آجائے تمہارے پاس رسول جو تصدیق کرنے والا ہو اس چیز کی جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ گے اور ضرور ضرور اس کی مدد کرو گے۔ فرمایا کیا تم نے اقرار کر لیا اور تم نے اس پر میرا مضبوط عہد قبول کر لیا؟ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم نے اقرار کر لیا، فرمایا سو تم گواہ رہو اور میں تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں[16]۔ "

بلکہ نبی کریم ﷺ کی بعثت اس لئے کی گئی کہ وہ دین حق (اسلام) کو باقی تمام باطل ادیان پر غالب کرے۔ ارشاد ہے:

"هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ[17] "

"اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے اپنے رسول ﷺ کو ہدایت اور دین حق دیکر اس لئے بھیجا کہ اس کو باقی تمام باطل ادیان پر غالب کر دے۔"

اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اگر سارے ادیان حق پر ہوتے تو پھر دین حق کو باطل ادیان پر غالب کرنے کے کیا معنی؟ ادیان تو دنیا میں بہت سارے موجود ہوں گے لیکن سارے حق پر نہیں ہیں۔ مثلاً آج کل بھی اسلام کے علاوہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت، بدھ مت، کنفیوشس ازم، جین مت، سکھ ازم وغیرہ مذاہب والے موجود ہیں۔ ان سب سے پرامن بقائے باہمی کے اصول کے تحت رواداری تو کر سکتے ہیں لیکن سب کو برحق تسلیم کرنا اور ایک لڑی میں پرونا کسی طور سے بھی درست نہیں ہے۔ کہیں پر خدائے واحد کا مضبوط تصور ہو کہیں پر تین آلہہ کا عقیدہ پایا جاتا ہو

اور کہیں پر خداؤں کی تعداد کروڑوں میں ہو، کہیں پر مخلوق خدا کو خدائی کا درجہ دیا جاتا ہو اور کہیں پر اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو اس کی اولاد کے طور پر سمجھا جاتا ہو۔ جن مختلف ادیان کے عقائد میں اتنا بڑا فرق اور تضاد پایا جاتا ہو ان کو ایک وحدت قرار دینا کس قدر نادانی اور حماقت ہو گی اور جب عقائد وافکار میں اتنا بڑا فرق ہے تو اپنے اپنے متعلقہ عقائد کی بنیاد پر عبادات اور اعمال میں کس قدر زیادہ فرق ہو گا۔

اسلام اگرچہ بقائے باہمی کے تحت باطل ادیان کو باطل سمجھتے ہوئے ان کی موجودگی کو تو تسلیم کرتا ہے لیکن قبول باہمی کا ہر گز روادار نہیں کہ ہر مذہب کو حق سمجھ کر اس کو قبول کیا جائے۔اس ضمن میں اسلام کسی قسم کی ملاوٹ برداشت نہیں کرتا۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ[18]"

"اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست مت بنانا، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور تم میں جو کوئی ان سے دوستی کرے گا وہ انہیں میں (شمار) ہو گا، بے شک اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔"

درج بالا آیت کے ذیل میں تفسیر ماجدی میں لکھا ہے کہ "مطلب یہ ہوا کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہوتے ہیں باقی خود یہود ونصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے کم سے کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں۔ان کے آپس میں اگر تمہارے خلاف ساز باز ہو جائے تو کچھ تعجب نہیں لیکن تم جو اہل ایمان ہو، تم میں اور منکرین قرآن میں مناسبت ہی کیا اور اشتراک کیسا؟۔۔۔۔۔۔۔ غیروں، بیگانوں، اللہ کے دشمنوں سے دوستی ہو نہیں سکتی، جب تک پہلے ان کی عظمت یا محبت کا نقش دل پر نہ بیٹھ لے اور مسلمان اپنی پختگی سے کچھ نہ کچھ ہٹ نہ لے، قومی تشخص اور ملت کی خودی کے لئے لازمی ہے کہ ملت اسلامی کے دوستانہ، رازدارانہ، برادرانہ تعلقات غیر مسلموں سے ممنوع قرار دیئے جائے، یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ دشمنانِ دین کے ساتھ، میل جول زیادہ رکھتے ہیں، ان کے اندر سے فہمِ دین اور دینی تصلب اور ملی خودداری رخصت ہو جاتی ہے[19]۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آسمانی مذاہب میں سے بعض باتیں ایک جیسی ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ موجودہ تمام مذاہب ایک ہو گئے۔ بلکہ مصالحت ومفاہمت کا تقاضا یہ ہے کہ انہی مشترکہ باتوں کو بنیاد بنا کر اہل کتاب کو دین اسلام کی طرف لایا جائے۔ان کو اسلام کی دعوت دینے میں اس انداز کو اختیار کیا جائے کہ اسلام کی امتیازی شان والی باتوں کا پہلے ذکر نہ کیا جائے بلکہ پہلے ان کو ان باتوں کی طرف متوجہ کیا جائے جو اسلام اور ان کے مذہب میں مشترک ہیں تاکہ وحشت نہ رہے اور وہ دین اسلام کے قریب ہو جائیں۔قرآن کریم میں ارشاد ہے:

"قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ[20]"

"اے نبی ﷺ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے اور وہ یہ کہ ہم ایک اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کی بندگی نہیں کریں گے اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو رب اور پروردگار نہیں بنائیں گے۔"

درج بالا آیت کے تحت مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

"اس آیت سے تبلیغ ودعوت کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر کوئی کسی ایسی جماعت کو دعوت دینے کا خواہشمند ہو جو عقائد و نظریات میں اس سے مختلف ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مخالف العقیدہ جماعت کو صرف اسی چیز پر جمع ہونے کی دعوت دی جائے جن پر دونوں کا تفاق ہو سکتا ہے۔ رسول ﷺ نے جب روم کے بادشاہ ہرقل کو اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا یعنی اللہ کی وحدانیت پر۔ (خط کا ترجمہ ملاحظہ ہو)" میں شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے، یہ خط محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے روم کے بادشاہ ہرقل کی جانب ہے، سلامتی ہو اس شخص کے لئے جو راہِ ہدایت کی پیروی کرے۔ بعد اس کے میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں، اسلام لا تو سلامت رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھ کو دوہرا اجر دے گا، اور اگر تو اعراض کرے گا تو تجھ پر ان سب انسانوں کا وبال ہو گا جو تیری رعایا ہیں۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر آکر جمع ہو جاؤ جو ہم اور تم دونوں میں برابر ہے، یہ کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرے اور نہ ہم اللہ کو چھوڑ کر آپس میں اپنوں کو رب بنائیں[21]۔"

اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اہل کتاب کے موجودہ دین کو برحق سمجھ کر ان کو اپنی حالت پر چھوڑنے کی تعلیم نہیں دی گئی ہے بلکہ ان کو دین اسلام (جو کہ اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے) کی طرف بلایا جائے۔ البتہ بلانے میں ہمارے اور ان کے مشترکہ مضامین سے آغاز کیا جائے اور جب وہ اس دعوت کو قبول کریں تو پھر اسلام کے دیگر احکام کی طرف ان کو متوجہ کیا جائے نہ کہ ان کو اپنے سابقہ دین کے مطابق عمل کرنے پر چھوڑا جائے۔ گویا اسلام اپنے پیروکاروں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ دین حق کی طرف بلانے میں بھی حتی الوسع مفاہمت و مصالحت کے پہلو کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ اس سے بھی بڑھ کر اسلام میدانِ جنگ میں برسرِ پیکار مسلمانوں کو تعلیم دے رہا ہے:

"وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ[22]"

"اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو (جھکو) اور بھروسہ کرو اللہ پر، بے شک وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔"

خلاصہ بحث

اسلام تعاون اور پرامن بقائے باہمی کا اعلیٰ پیمانے پر روادار ہے لیکن "قبول باہمی"، کا ایک لمحہ کے لئے بھی متحمل نہیں ہے۔ لہذا اگر مسلمان اپنے دین متین کی احیاء، سربلندی، پھیلاؤ اور حفاظت کے لئے اجتماعی طور پر سرگرم عمل ہوں تو غیروں کے ساتھ صلح کرنے میں اس حد تک جا سکتے ہیں کہ جس سے اسلام کی فتح ونصرت،

حفاظت اور مخالفین کی ہدایت کا قوی امکان ہو جبکہ اسلام کے بنیادی تصور اور اسکے امتیازی شان پر کوئی ضرب نہ پڑے۔

حواشی وحوالہ جات

1سورۃالانعام٦ : ٨٢

2 سورۃالبقرہ٢: ١٢٥

3سورۃآلعمران٣: ٩٦

4ابن رجب،زین الدین عبدالرحمان،فتح الباری،شرح صحیح البخاری١: ٤٣- ٤٤،مکتب تحقیق دار الحرمین،القاھر،١٤١٧ھ/ ١٩٩٦ء

5 آل عمران:١٩

6سورۃآلعمران٣: ٨٥

7 محمد اجمل خان،سیدنا رسول عربی ﷺ: ٤٠٨- ٤٠٩،الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور،٢٠٠١ء

8سورۃالکافرون١٠٩: ١- ٦

9 البدایہ والنہایہ٥: ٢٩

10سورۃالروم٣٠: ٣١

11 امام مسلم،مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم١: ١٥٧ ،خالد احسان پبلشرز لاہور،١٩٨١ء

12سورۃالمائدہ٥: ٥٧

13 ابوداؤد،سلیمان بن اشعث،سنن أبوداؤد١: ١٧،المکتبۃ العصریۃ، صیدا–بیروت (س۔ن)

14سنن أبوداؤد،کتاب اللباس،باب فی لبس الشہرہ،حدیث(٤٠٣١)

15سورۃ البقرہ٢: ٦٢

16محمد عاشق الٰہی بلند شہری،انوار البیان فی کشف اسرار القرآن: ١٠٣- ١٠٤،،ادارہ تالیفات اشرفیہ،ملتان(س۔ن)

17سورۃ التوبہ٩: ٣٣

18سورۃ المائدہ٥: ٥١

19 مولانا عبدالماجد دریابادی، تفسیر ماجدی١: ٩٢٩، مجلس تحقیقات ونشریات اسلامی لکھنؤ،ج١،ص٩٢٩۔

20سورۃآلعمران٣: ٦٤

21 مفتی محمد شفیع،معارف القرآن٢: ٨٧،ادارہ المعارف کراچی(س۔ن)

22سورۃالانفال٨: ٦١